مولانا زاہد الراشدی

دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کیوں؟

صدر جنرل پرویز مشرف نے ۱۲ جنوری کی شب قوم سے خطاب کرتے ہوئے جن خیالات اور فیصلوں کا اعلان کیا ہے ،ان پر نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر مختلف اطراف سے اظہار خیال ہو رہا ہے۔ بعض حلقے اسے پاکستان میں ایک نئی سیاسی زندگی اور معاشرتی رجحان کا آغاز قرار دے رہے ہیں اور یہ توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں کہ اگر صدر پرویز مشرف کے اعلان کردہ اقدامات پر عملدرآمد ہوا تو حالات میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوں گی اور پاکستان ایک نئے اور پہلے سے مختلف دور میں داخل ہو جائے گا۔ ایسا ہوتا ہے یا نہیں، یہ آنے والا وقت بتائے گا وران فیصلوں پر عملدرآمد کے حوالے سے اسٹیبلشمنٹ کی عملی ترجیحات بہت جلد ان توقعات کے مستقبل کی نشاندہی کر دیں گی ،اس لیے اس پہلو کو کسی مناسب موقع کیلئے مؤخر کرتے ہوئے صدر پرویز مشرف کے خطاب کے بعض حصوں پر معروضی حقائق اور حالات کی روشنی میں ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

صدر محترم نے دینی مدارس کے کردار کو سراہتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے کہ دینی مدارس ملک کے لاکھوں افراد کو نہ صرف مفت دینی تعلیم دے رہے ہیں، بلکہ انہیں بلا معاوضہ ہاسٹل اور خوراک کی سہولتیں بھی فراہم کر رہے ہیں اور یہ کام ایسا ہے جو کوئی بڑی سے بڑی این جی او بھی نہیں کر سکتی ،لیکن انہیں شکوہ ہے کہ ان دینی مدارس میں صرف دینی تعلیم دی جاتی ہے جو قومی زندگی کے اجتماعی دھارے میں شامل ہونے کیلئے کافی نہیں ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ دینی مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس، ریاضی، انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم بھی دی جائے اور حکومت اس مقصد کے لئے آرڈیننس لا رہی ہے، جس کے ذریعے دینی مدارس ان علوم کو اپنے نصاب میں شامل کرنے کے پابند ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ دینی مدارس کے مقصدِ قیام اور ان کے معاشرتی کردار کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، کیونکہ دینی مدارس تو سرے سے اجتماعی دھارے کی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے دعوے دار ہی نہیں ہیں اور ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ معاشرے میں قرآن وسنت اور دینی ضروریات کے ساتھ عام مسلمان کا تعلق قائم رہے۔ مسلمانوں کو مسجد میں نماز پڑھانے کیلئے امام اور مدرسہ میں قرآن وحدیث پڑھانے کیلئے اساتذہ میسر آتے ہیں اور یہ اہم شعبہ رجال کار کے حوالے سے خلاء کا شکار نہ ہو جائے۔ دینی مدارس نے اسی مقصد کیلئے اب تک یہ حکمتِ عملی سوچ سمجھ کر اختیار رکھی ہے کہ ان کے پیدا کردہ افراد دینی خدمات کے علاوہ کسی اور شعبہ میں نہ کھپ سکیں، کیونکہ اگر ان کے تیار کئے ہوئے لوگ بھی جدید علوم سے آراستہ ہو کر اجتماعی دھارے میں ضم ہو جائیں گے تو مسجد کیلئے امام، مکتب کیلئے قاری وحافظ اور مدرسہ کیلئے دینیات کے مدرس کون فراہم کرے گا؟ اور اس شعبہ میں افراد کار کا جو خلاء پیدا ہو جائے گا، اسے پر کرنے کی کیا صورت ہوگی؟

یہ سوال اس وقت زیادہ سنگین اور نازک صورت اختیار کر جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسجد و مدرسہ کیلئے آئمہ وخطباء اور اساتذہ و مدرسین فراہم کرنے کی ذمہ داری کوئی ریاستی ادارہ قبول نہیں کر رہا اور ان دینی مدارس کے علاوہ سرے سے اور کوئی انسٹی ٹیوٹ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کام میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات کو اجتماعی دھارے میں ضم کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسجد و مدرسہ کا شعبہ خود بخود رجال کار کی کمی کا شکار ہو جائے گا اور اس طرح معاشرے میں عام مسلمان کا دین کے ساتھ تعلق باقی رکھنے، دینی علوم کی حفاظت و ترویج، عبادات کے نظام کا تسلسل برقرار رکھنے اور قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس کا پورا نظام تعطل کا نذیر ہو سکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ تعلیم کی تقسیم کار کے اس دور میں جب ایک ڈاکٹر کیلئے انجینئر ہونا ایک انجینئر کیلئے حافظ ہونا اور ایک وکیل کے لئے سائنسدان ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا تو ایک مولوی کے لئے سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم کو کیوں ناگزیر قرار دیا جا رہا ہے۔ اس لئے جہاں تک دینی مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان، ضروری حساب اور کمپیوٹر کے استعمال کی ٹریننگ کو شامل کرنے کا تعلق ہے، ہم نہ صرف اس کے حق میں ہیں، بلکہ صدر پرویز مشرف سے پہلے اور بہت پہلے سے اس بات کیلئے دینی مدارس پر زور دے رہے ہیں اور ہماری معلومات کی حد تک دینی مدارس کے مختلف وفاقوں نے اس کی طرف عملی پیش رفت بھی کی ہے، لیکن ایک امام، خطیب، مفتی، حافظ، قاری اور دینیات کے مدرس کو زبردستی انجینئر اور سائنسدان بنانے والی بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، اگر صدر پرویز مشرف اس کی ضرورت وافادیت کے بارے میں کچھ ارشاد فرما سکیں تو ان کی بے حد نوازش ہوگی۔

صدر محترم نے دینی حلقوں سے شکوہ کیا ہے کہ وہ صرف جذبات کے تحت کام کرتے ہیں اور انہوں نے ہزاروں لوگوں کو افغانستان لے جا کر مروا دیا ہے، جبکہ افغانستان کی تعمیر نو اور افغان عوام کی ضروریات زندگی کی طرف انہوں نے توجہ نہیں دی۔ ہمارے نزدیک یہ بات بھی غلط فہمی پر مبنی ہے اور صدر محترم کو اس سلسلہ میں صحیح معلومات فراہم نہیں کی گئیں جہاں تک افغانستان لے جا کر مروا دینے کا تعلق ہے، یہ کام گزشتہ پندرہ سال سے جاری ہے اور پاکستان کے دینی حلقے اس وقت سے پاکستانیوں کو افغانستان لے جا کر مروا رہے ہیں، جب افغانستان میں روس نے فوجیں اتاری تھیں اور افغان علماء وعوام نے علم جہاد بلند کر کے مزاحمتی جدوجہد کا آغاز کیا تھا تب سے پاکستانی مسلسل افغانستان جا رہے ہیں اور وہاں مر بھی رہے ہیں، فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ پہلے مرحلہ میں جب یہ جنگ روس کے خلاف تھی تب ''جہاد'' کہلاتی تھی اس میں مرنے والوں کو ''شہید'' کہا جاتا تھا اور لڑنے والے ''مجاہد'' اور ''فریڈم فائٹر'' شمار ہوتے تھے۔ انہیں پاکستان کی حکومت، فوج اور آئی ایس آئی کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھی، عالم اسلام اور امریکہ ان کی امداد کر رہے تھے لیکن جب اسی جنگ کا رخ امریکہ کی طرف ہوا تو وہ جنگ اچانک ''جہاد'' سے ''دہشت گردی'' بن گئی۔ اس میں مرنے والے کیلئے ''شہید'' کی بجائے ''مروا دینے'' کی اصطلاح سامنے آئی اور اس میں حصہ لینے والے ''مجاہد'' اور ''فریڈم فائٹر'' کی بجائے ''دہشت گرد'' کے خطاب سے بہرہ ور ہو گئے۔

صدر محترم سے گزارش ہے کہ دینی حلقوں کے موقف اور کردار میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی اور انہوں نے جس طرح روسی استعمار کی بالادستی کو افغانستان کی آزادی اور خودمختاری کے منافی سمجھا، اسی طرح امریکی استعمار کی کی بالادستی کو بھی افغانستان

کی آزادی اور خود مختاری کے منافی قرار دیا اور دونوں کے خلاف یکساں طرز عمل اور رویہ اختیار کیا، اس لئے اگر افغانستان میں پاکستانیوں کو لے جا کر مروانے کی ذمہ داری کسی پر عائد کی جاسکتی ہے تو اس کا ذمہ دار وہ طبقہ اور عنصر ہے جس نے اچانک ''یوٹرن'' لے کر روس کے کفر و استعمار کو نا قابل برداشت اور امریکہ کے کفر و استعمار کو قابل قبول قرار دے کر ذہنوں میں کنفیوژن پیدا کیا اور پھر اپنے اس متضاد موقف کے حق میں کوئی معقول دلیل پیش کرنے میں ناکام رہا کہ روس کے کفر و استعمار کے خلاف پاکستانیوں کا افغانستان جا کر امریکی جارحیت کے خلاف سینہ سپر ہونا آخر کیوں دہشت گردی ہو گیا ہے؟ صدر پرویز مشرف اس سوال پر بھی دینی حلقوں کو کوئی تسلی بخش جواب دے سکیں، تب ان کا بے حد کرم ہوگا۔ باقی رہی بات کہ افغانستان کی تعمیر نو اور افغان عوام کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کیلئے دینی حلقوں نے کیا جدوجہد کی ہے؟ تو اس کے جواب میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر امریکی بمباری کے سامنے اپنے افغان بھائیوں کے شانہ بشانہ جا کھڑے ہوئے اور انہی کے ساتھ جام شہادت بھی نوش کیا، ان سے یہ سوال کرنے کا حوصلہ صدر پرویز مشرف ہی کر سکتے ہیں کہ تم نے پیسے کتنے اکٹھے کئے تھے؟ اور اپنی جانوں کے ساتھ ساتھ مال کتنا لے کر آئے ہو؟ لیکن اس کے باوجود مال جمع کرنے اور افغان عوام کی مالی مدد کرنے کا محاذ بھی خالی نہیں رہا۔ افغانستان کی تعمیر نو کیلئے پاکستانی سائنس دان ڈاکٹر سلطان بشیر الدین محمود نے ''امہ تعمیر نو افغانستان'' کے عنوان سے ایک باقاعدہ ادارہ قائم کیا تھا اور بہت سے پاکستانی بھائیوں کے تعاون سے افغانستان میں کروڑوں روپے کی سرمایہ کاری کی، جس کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ غیر ملکی اور غیر مسلم این جی اوز نے اس حوالے سے جو کام کیا، صدر پرویز نے اپنے خطاب میں ان کو خراج تحسین پیش کیا اور ڈاکٹر سلطان بشیر محمود کو ان کی خدمات اور قربانیوں کا صلہ پرویز مشرف حکومت کی طرف سے گرفتاری، نظر بندی اور ''امہ تعمیر نو'' کو خلاف قانون قرار دینے کی صورت میں ملا۔ اسے بھی اگر صدر جنرل پرویز مشرف اپنے تدبر، حوصلہ اور حکمت و دانش کا شاہکار بتائیں تو انہیں اس سے کون روک سکتا ہے؟

اس کے علاوہ افغان عوام کی مالی مدد، ان کی ضروریات کی کفالت، ان کی آبادکاری اور افغانستان بھر میں پانی کے کنویں، روٹی کے تنور، مساجد، مدارس، بیواؤں، یتیموں اور معذوروں کے وظائف اور دیگر شعبوں میں کراچی کے ''الرشید ٹرسٹ'' نے جو مسلسل خدمات سرانجام دی ہیں، وہ کسی بھی مغربی این جی او سے کم نہیں ہیں، لیکن چونکہ اس کا نظام علماء کے ہاتھ میں تھا اس لئے اسے خلاف قانون قرار دینا حکومت کیلئے ضروری ہو گیا تھا اور افغانستان میں عیسائیت کی تبلیغ کیلئے رفاہی کاموں کی آڑ لینے والی این جی اوز صدر پرویز مشرف کی ممدوح این جی اوز کا مقام پا گئی ہیں۔

''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے''

بات کو مزید آگے بڑھانے کی بجائے بطور نمونہ انہی دو پہلوؤں پر اکتفا کرتے ہوئے صدر جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ دینی حلقوں کے خلاف غصہ نکالنے، انہیں رگیدنے اور مغرب کو سنا سنا کر انہیں کوستے رہنے کا شوق ضرور پورا کریں لیکن کم از کم معروضی حقائق کو تو سامنے رکھیں، کیونکہ معروضی حقائق کی فائل کو ایک طرف رکھتے ہوئے محض کوستے چلے جانا خود ان کے منصبی مقام و مرتبہ کے منافی ہے۔

محمد عابد مسعود ڈوگر

نئے تعلیمی سال کے آغاز پر چند باتیں

ہمارے بزرگوں میں ایک نام ہے مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ، جو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور حکیم الامت شاہ محمد اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ کی اصلاحی صحبت اٹھائی (حضرت مدنیؒ نے بیعت کے بعد تزکیہ نفس کے لئے انہیں حضرت تھانوی کے سپرد فرمادیا تھا) اردو پڑھنے والوں کے لئے یہ نام بہت جانا پہچانا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے ہاں حاضر ہوا۔ آپ کی خلوت گاہ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے آپ کے رونے کی آواز سنی تو میں دروازے پر ہی رک گیا کہ نجانے کیا بات ہو؟ کافی انتظار کے بعد جب میں نے محسوس کیا کہ رونے کی آواز ہچکیوں میں بدل گئی ہے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور اندر داخل ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر مولانا جوہر نے سامنے رکھے قرآن پاک سے سر اٹھایا اور مجھے غور سے دیکھنے کے بعد دیر تک اپنے آپ کو سنبھالتے رہے۔ میں نے جرأت کر کے پوچھا کہ مولانا! کیا بات ہوگئی جس نے آپ کو اتنا رلا دیا؟ ہاتھ سے قرآن پاک کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو آپ کی انگلی اس آیت پر تھی "الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون" (المائدہ:۳) مجھے بات سمجھ نہ آئی، عرض کیا کہ میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ فرمایا کہ اللہ نے ہمیں کتنے بڑے انعام سے نوازا ہے، تکمیل دین، اتمام نعمت اور دین اسلام کو ہمارے لئے پسند کر لینے کا انعام۔ یہ سارے انعامات ایک شرط سے مشروط ہیں کہ "مجھ ہی سے ڈرو، ان (کفار) سے مت ڈرو" کسی کی فکری، سیاسی، تہذیبی، تمدنی، معاشی اور معاشرتی قوت کو اپنے سے برتر خیال کرتے ہوئے اپنی تمام سرفرازیوں کو کہیں زہر آلود کر کے تاریخ میں خود کو کہیں رسوا نہ کر لینا۔ جس انعام سے میں نے (اللہ نے) تجھے نوازا ہے، اس کی بے قدری کا جرم نہ کر بیٹھنا۔ لیکن میرے ایمان پر تو نجانے اغیار کے کتنے بیوند لگے ہوئے ہیں۔ ہماری معاشرتی اور گھریلو زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جسے ہم نے مغربی تہذیب گھول نہ دیا ہو۔ جب میں اپنی قوم کی یہ حالت دیکھتا ہوں تو پریشانی میں ڈوب جاتا ہوں کہ یا اللہ! تیرا انعام تو مشروط تھا میں ابھی تک شرط کے مرحلے پر ہی نہیں پہنچا، میرے لئے یہ کس کام کا؟ عبدالماجد! یہی وہ چیز ہے جو مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہے وہ چیز ہے جس نے مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ لافانی شعر کہلوایا ؎

تو حید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

قوموں کی زندگی میں سب سے خطرناک لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے نظریات پر مکمل اعتماد کی بجائے اغیار سے متاثر ہو کر ان میں دریوزہ گری کرنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مضبوط نظریاتی قوت عطا کر رکھی ہوتی ہے اور سینکڑوں برس کی روشن تاریخ ان کی پشت پر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جب کوئی نیا فکری انقلاب آتا ہے تو وہ اس کی چکاچوند سے متاثر ہو کر اپنی فکری بنیادوں کو متزلزل کرنے لگتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال یونانی دور ہے۔ جب ہمارا یونانیوں سے بنوعباس کے دور میں واسطہ پڑا تو

ہمارے یہاں بڑے بڑے ''دانشور'' پیدا ہوئے جنہوں نے یہ فلسفہ پڑھا اور اس سے متاثر ہو کر اسلام کی بہت سی باتوں کے بارے میں عقیدے کی کمزوری کا شکار ہوئے۔ جب تک امام غزالیؒ جیسے لوگ نہیں اٹھے، انہوں نے دریوزہ گری نہیں چھوڑی۔ کبھی اس سے کوئی چیز لے لی، کبھی اس سے کوئی چیز لے لی۔ کئی برس یہ بے فکرے دانشور ادھر ادھر مارا ماری کرتے رہے اور اخوان الصفاء کے نام سے نجانے کیا کیا فتنے اٹھاتے رہے، یہ دھکے ان ''مفکروں'' کو اس لئے کھانے پڑے کہ انہوں نے یہ رویہ چھوڑ دیا تھا جس کی تاکید قرآن نے کی ہے ''فلا تخشوھم واخشون'' کہ صرف اللہ کی پرواہ کریں، کسی اور کو پلے نہ باندھیں۔ اپنی تہذیب ومعاشرت، فکری نظریات اور معاشی ضروریات کے لئے اللہ کی طرف سے عطا کردہ کتاب ہدایت سے رہنمائی لیں نہ کہ فکر وشعور سے تہی دست لوگوں کے سامنے کاسہ لیسی کرتے پھریں۔ یہ وہ رویہ ہے جس کا درس ہمیں قرآن دیتا ہے۔ جب ہم نے یہ رویہ چھوڑا، ہمیں در در کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ برطانوی سامراج کی غلامی کے دور میں جب مغربی دنیا سے بہت افکار ہم پر وحی کی صورت میں برسنے لگے تو یہاں بہت سے نیم خواندہ لوگوں کو دانشوری کا دورہ پڑا۔ مغربی ''مفکروں'' کے ان مشرقی ایڈیشنوں کی اکثریت صرف دیسی لہجے میں ولایتی چیخیں ہی مار سکتی تھی، اس کے علاوہ ان میں کوئی ''گن'' نہیں تھا۔ ایک لمبے عرصے تک ان مفکرین کا کام صرف یہ رہا کہ یہ ''ڈارون'' اور ''سگمن فرائیڈ'' کی بے ہودہ تھیوریاں چپک چپک کو سناتے اور دین اور اہل دین پر پھبتیاں کستے تھے۔ یہاں ان مفکرین کے خلاف سوچنا بھی دل گردے کی بات تھی، ان کا رد کرنا تو دور کی بات ہے۔ اسی دوران بہت سے اقوال تہذیبی، قانونی اور بعض ٹیکنالوجی کے حوالوں سے یہاں پہنچے جن کی دریوزہ گری آج تک ہو رہی ہے۔ لیکن اب حالت پچاس ساٹھ سال پہلے جیسی نہیں ہے۔ آج کے دور میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں (جو ہرگز مولوی نہیں ہیں) اور وہ ڈارون جیسے بے شعور لوگوں کو ماضی کا ''بیوقوف ترین'' کردار گردانتے ہیں اور برسرعام گردانتے ہیں۔ یہی باتیں جب ہمارے اسلاف صالحین نے کہی تھیں تو انہیں ان سب لوگوں نے ''ان پڑھ''، ''دیہاتی ملا'' کہہ کر رد کر دیا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ کئے بغیر جو بات ٹھیک اور درست تھی، کہی اور اپنے روحانی بچوں کو پڑھائی کیونکہ ان دیہاتی مولویوں میں سے کوئی بھی الحمدللہ احساس کمتری کا شکار نہیں تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان ملاؤں نے گوری چمڑی والوں کو کبھی اہمیت ہی نہیں دی تو ان کی ذہنی وفکری غلامی وہ کیوں قبول کرتے؟ پچھلی صدی کی چوتھی، پانچویں اور چھٹی دہائی میں مصر اور بہت سے عرب ممالک میں افسانہ نویس اور ناول نگار لوگوں کی ایک یلغار ہوئی اور موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے مستشرقین نے بھی عربی ناموں کے ساتھ اپنی زہر آلود تحریریں چھپوا کر عام کیں۔ نتیجتاً پہلے پہل ''اباحت'' کے دروازے کھولے گئے کہ یہ چیز بھی جائز ہے، اسے کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس بات کو تو علماء تک کا طبقہ بری طرح متاثر ہوا اور لادین لوگوں نے سگریٹ، سگار سے لے کر جاندار کی تصاویر تک کو بلا کراہت حلال قرار دے ڈالا۔ اللہ بھلا کرے سید علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء فکر کا، جنہوں نے اس طوفان کو روکا اور عربی زبان میں ایسی کتب لکھیں جن کی وجہ سے عرب دنیا صحیح اسلامی ادب سے واقف ہوئی۔ عالم عرب کے سلیم الفکر علماء کا کردار بھی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، جنہوں نے عرب وعجم کے فاصلے کو مٹاتے ہوئے اس دیار کے اہل علم کو خندہ پیشانی سے قبول کیا جس کی وجہ سے اس طوفان کے سامنے بند باندھنا ممکن ہوا۔ ہمارے یہاں بھی اس طرز کے کئی ڈرامے ہوئے، جنہوں نے یہاں کے

پڑھے لکھے لوگوں کو خاصا پریشان کیا۔ جو لوگ نظریاتی طور پر خالی ہاتھ یا کمزور تھے، وہ تو بہہ گئے لیکن جن لوگوں نے اپنا رشتہ مرکز سے نہیں توڑا اور ہر مشکل میں کتاب ہدایت اور رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ سے رہنمائی لیتے رہے، وہ خوش بخت ہر دم مطمئن ہیں۔ ماسکو سے اٹھنے والا سرخ انقلاب ہو یا سوشلزم کا شور، کوئی بھی چیز نظریاتی لوگوں کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکی، ایسے لوگ یہاں بکثرت موجود رہے جن کی وجہ سے اسلام مخالف نظریات یہاں عوام میں اپنی جگہ نہ بنا سکے، یقیناً اس میں مدارس دینیہ کا بہت بڑا کردار ہے۔ لیکن یہ فتنے ہنوز سوچوں میں اپنا زہر گھول رہے ہیں، ان کا پورا تعارف تو ایک ضخیم کتاب کا تقاضا کرتا ہے، ان سے بچنے اور عام آدمی کو بچانے کیلئے مضبوط علمی مطالعے کی ضرورت ہے تاکہ فکری محاذ پر ان کے دانت کھٹے کئے جاسکیں۔ آج کل طالبان ان کا خاص نشانہ ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ طالبان کے جانے کے بعد عام آدمی خاصا پریشان ہے اور بڑے بڑے اہل علم بھی اس صدمے کا شکار ہیں مگر مایوس ہرگز نہیں، کیونکہ یہ زمانے کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ نظریہ بہر حال اپنی جگہ قائم ہے، یہ یقیناً نظریئے کی شکست نہیں ہے۔ تاریخ میں بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ روئے زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کی کوشش اس کے بندوں نے کیں، کچھ کامیاب ہوئیں اور کچھ کا نتیجہ اس وقت ظاہر نہ ہوا۔ جیسا کہ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ اور آپ کے رفقاء کی مقدس تحریک جہاد جس میں چار دفعہ آپ نے اور آپ کے رفقاء نے اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کوئی صورت اس وقت نہ بن سکی تو کیا ان کی سعی، سعی لاحاصل ہوگئی؟ یقیناً ایسا نہیں ہے، آج تک اس مقدس جماعت کا جذبۂ جہاد اور کارنامے مجاہدوں کے جذبوں کو تازگی بخشتے اور نئے ولولے عطا کرتے ہیں۔ طالبان کا روشن کردار بھی تاریخ کا حصہ ہے جو نجانے کب تک راہ وفا کے راہیوں کی راہنمائی کرتا رہے گا؟ ابھی تو اس لڑائی کے اصل معرکے باقی ہیں، ابھی سے حوصلہ نہ ہاریئے اور اصل فیصلہ آنے والے وقت پر چھوڑ دیجئے۔

ہم روح سفر ہیں، ہمیں ناموں سے نہ پہچان — کل کسی اور نام سے آجائیں گے ہم لوگ

دینی مدارس کے طلباء کرام کا کردار آنے والے وقت میں بہت اہم ہے اور آپ کیلئے یہ سفر پھولوں کی سیج شاید نہ ثابت ہو، بلکہ کانٹے ہی کانٹے ہو سکتے ہیں جو غیروں سے زیادہ اپنوں کے بچھائے ہوئے ہیں، اس لئے ہر حوالے قدم احتیاط سے رکھنے کی ضرورت اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اپنے مطالعے کو مضبوط کریں تاکہ کوئی بھی تحریر و تقریر آپ کے نظریئے میں دراڑ نہ ڈال سکے۔ امت پر اس وقت بہت کڑا امتحان ہے، یقیناً اس میں کامیابی کے لئے اصل کردار آپ کا ہی ہے۔ علماء کے علمی اختلافات صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور اس میں ایک دوسرے کا باہمی احترام ہمیشہ موجود رہا ہے۔ ہمارے اکابر کی زندگیوں میں اس جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ آج کے دور میں ان اختلافات کو اعتدال میں رکھنے کی بہت ہی ضرورت ہے۔ آپس میں منظم ہو کر، ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملاتے ہوئے ہر محاذ پر مقابلہ کرنے کی اجتماعی حکمت عملی تیار کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ دشمن کی نظر تمام دینی مدارس پر ہے؛ نہ کہ کسی ایک خاص مسلک کے مدارس پر، اس خطرے سے خبردار ہو جانا چاہیے۔ ''صفہ'' کے مقدس چبوترے سے چلنے والا مدارس کا یہ سلسلہ تو ان شاء اللہ تا قیامت چلے گا، دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے اس روایت کو مزید اجلا اور باقی رکھنے کے لئے کیا کردار ادا کیا؟